اردو ریسرچ جرنل "تشکیل" جلد:2، شمارہ:2 (جولائی تا دسمبر 2024ء)
ISSN (Online): 3007-3294, ISSN (Print): 3007-3286, HEC Recognized Y-Category Journal

ڈاکٹر غلام فریدہ
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

اُردو افسانے "آنندی" کا ردِ تشکیلی مطالعہ

Dr. Ghulam Farida
Assistant Professor, Department of Urdu, IIU, Islamabad

A Deconstructive Study of Urdu Short Story *"Aanandi"*

ABSTRACT
Ghulam Abbas is an important Urdu fiction writer of the 20th century. "Anandi" is one of his representative short stories. This story shows the double standards of society and exploitive behaviors prevailing in society. However, a close study of the text reveals that it revolves around the settlement of a new city and related details. There are many technical gaps in the story. In this paper, the textual and deconstructive study of Anandi will bring out all the gaps in it, which will present a new understanding of this short story.

Keywords: *Ghulam Abbas, Anandi, Urdu, Short Story, deconstruction, deconstructive study, close study, textual study, gaps, Bianary Oppositions*

ردِ تشکیل (Deconstruction) 1960ء کی دہائی میں پیش کیا جانے والا ادب، زبان اور فلسفے کا ایک جدید تصور ہے۔ یہ تصور فرانسیسی فلسفی ژاک دریدا نے پیش کیا۔ اس تصور کی رو سے کسی بھی متن کی تفہیم صرف اس کے مقررہ معنی کے تناظر میں ہی نہیں کی جاسکتی۔ بلکہ معنی کی تلاش ایک مسلسل عمل ہے۔ چنانچہ ہر متن کو زبان، سیاق و سباق اور قاری کے بدلتے نقطۂ نظر کے مطابق نئے انداز سے سمجھا جا سکتا ہے۔ سوسئیر کے لسانی نظریات کی روشنی میں ڈی کنسٹرکشن کو سمجھا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ زبان اختلافات کے ذریعے چلتی ہے۔ مثال کے طور پر، کسی لفظ کے معنی اس بات پر منحصر ہوتے ہیں کہ وہ کیا نہیں ہے۔ یہ نقطۂ نظر متون کے متعینہ معنی کے تصور کو رد کرتا ہے۔ یوں ردِ تشکیل پہلے سے قائم کردہ مفروضوں پر سوال اٹھانے، ڈسکورس اور معنی کے پوشیدہ ڈھانچے کو بے نقاب کرنے اور متن سے باہر نکل کر معنی کی کھوج کو وسعت دینے کا تصور ہے۔ ردِ تشکیل اکثر اضدادی جوڑوں (Binary oppositions) کو ہدفِ تنقید بناتی ہے۔ یہ جوڑے کسی خاص ثقافتی یا سماجی تناظر میں مخصوص معنویت کے حامل

ہوتے ہیں۔ان کے اضدادی معنی سے ہمارے لیے ان کی معنویت آسان ہو جاتی ہے۔مثال کے طور پر، ہم "روشنی" کو سمجھتے ہیں کیونکہ ہم اس کا موازنہ "اندھیرے" سے کر سکتے ہیں۔

ردِ تشکیل متن کے ایسے عناصر کی طرف توجہ مبذول کراتی ہے جنھیں عام طور نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔دریدا ان عناصر کے لیے "ضمیمہ" کی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔وہ اس موقف کو پیش کرتا ہے کہ کس طرح بظاہر غیر اہم سمجھے جانے والے یہ عناصر معنی کو غیر مستحکم کرتے ہیں اور معنی کی نئی پرتوں کو سامنے لاتے ہیں۔اسی طرح ردِ تشکیل کسی بھی متن کے اندر موجود تضادات، خلا اور ابہام کو سامنے لاتا ہے۔اس تحقیقی مقالے میں غلام عباس کے افسانے "آنندی" کا ردِ تشکیلی مطالعہ کیا گیا ہے جس سے متن کے نئے معنی کو سامنے لایا گیا ہے اور اس میں موجود ابہام، تضادات اور خلا کو بھی نشان زد کیا گیا ہے۔

غلام عباس بیسویں صدی کے مُمتاز اردو افسانہ نگار ہیں۔اُن کے افسانے سماجی مسائل، نفسیاتی بصیرت اور انسانی جذبات کی پیش کش کا واضح اظہار ہیں۔ "آنندی" اُن کا نمائندہ افسانہ ہے۔اس افسانے میں غلام عباس نے ہمارے دوہرے معاشرتی معیارات اور نام نہاد اخلاقیات پر گہرا طنز کیا ہے۔

آنندی ایک ایسے علاقے کی کہانی ہے جہاں مقامی بلدیہ علاقے کو غیر اخلاقی سرگرمیوں سے پاک کرنے کی کوشش میں طوائفوں کو شہر بدر کرنے کا فیصلہ کرتی ہے۔اس مقصد کے لیے شہر سے چھ کوس دور ایک غیر آباد علاقے کو طوائفوں کے لیے بسایا جاتا ہے تاکہ شہر کے لوگ اُن کے شر سے محفوظ رہ سکیں۔اس نئی آبادی میں طوائفوں کے لیے نئے مکانات تعمیر کیے جاتے ہیں۔رفتہ رفتہ سارا کاروباری طبقہ بھی اس نئی آبادی کا رخ کرنے لگتا ہے۔یوں یہ نئی بستی زیادہ وسیع اور خوشحال کاروباری اور رہائشی علاقہ بن جاتی ہے۔چنانچہ وہی لوگ جو شروع میں اس کی مخالفت کرتے تھے اس نئی آبادی سے مستفید ہونے لگتے ہیں۔آخر کار، طوائفوں کی یہ بستی ایک منظم اور جدید شہر میں بدل جاتی ہے جو اصل شہر سے زیادہ بہتر سہولیات کا حامل ہے۔افسانے کے اختتام پر ایک بار پھر بلدیہ کو اسی مسئلے کا سامنا ہے اور اب کی بار بلدیہ کے اجلاس میں طوائفوں کو شہر سے بارہ کوس دور منتقل کرنے کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔

فنی نقطہ نظر سے اِس افسانے کی کہانی دائروی تکنیک میں لکھی گئی ہے۔اِس تکنیک میں لکھی گئی کہانیوں کا نقطۂ آغاز ہی ان کا نقطۂ اختتام ٹھہرتا ہے۔افسانہ نگار جن واقعات یا جس صورت حال سے کہانی کا آغاز کرتا ہے؛ایک پورا دائرہ مکمل کرنے کے بعد دوبارہ اسی نکتے پر لے آتا ہے جہاں پھر سے وہی صورت حال در پیش ہوتی ہے۔آنندی میں بھی غلام عباس نے زنان بازاری کو شہر بدر کرنے کے جس مسئلے کو آغاز میں پیش کیا ہے وہی مسئلہ بیس برس بعد ایک نئی جگہ پر انہی کرداروں کو ایک بار پھر سے در پیش ہے۔

کہانی میں تاریخی حوالے سے شہر کا نام آنندی بتایا گیا ہے جو کہ اس شہر کا قدیمی نام بھی ہے؛ تاہم اس بستی کے کئی اور نام بھی متن میں استعمال کیے گئے ہیں۔ ایک جگہ تانگے والوں کی زبانی اسے "نئی بستی" کہا گیا ہے۔ اسی طرح یہ بھی بتایا گیا ہے کہ شروع شروع میں اسے "حُسن آباد" اور "حَسن آباد" کے ناموں سے بھی موسوم کیا گیا۔ "زنانِ بازاری" کا نام بھی متن میں استعمال ہوا ہے۔

افسانے کا عنوان "آنندی" اس کے موضوع کی وضاحت کرنے سے قاصر ہے۔ لفظ "آنند" کے معانی خوشی کا گیت، شادیانہ یا مُسرت کے ہیں۔ پوری کہانی پڑھنے کے بعد بھی یہ شہر کسی بھی پہلو سے خوشی کا گہوارہ معلوم نہیں ہوتا۔ افسانے میں یہ بتایا جاتا ہے کہ پرانی بوسیدہ کتابوں کی وَرق گردانی اور نوشتوں کی چھان بین کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ سینکڑوں برس پیشتر، اجڑنے سے پہلے یہ شہر آنندی کے نام سے موسوم تھا۔ یہاں یہ پہلو غور طلب ہے کہ اگر اس پرانے شہر کی تاریخ کتابوں میں محفوظ ہے تو یقیناً اس قدیمی شہر کی تہذیبی و ثقافتی تاریخ بھی کتابوں میں لکھی گئی ہو گی، لیکن اس کا حوالہ کہیں موجود نہیں ہے۔ اس تاریخ کے مطالعے سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ کیا وہ شہر واقعی آنند یعنی خوشی کا گہوارہ تھا یا نہیں۔ مزید براں اس بات کی بھی کوئی وضاحت نہیں ملتی کہ اس آباد شہر کو آخر کیا حادثہ پیش آیا جس کے باعث وہ بالکل کھنڈر بن کر رہ گیا تھا۔

کہانی میں جس موقف کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے وہ زنانِ بازاری کی وجہ سے پیدا ہونے والے اخلاقی اور کرداری مسائل ہیں۔ متن میں بارہا اس بات کو دہرایا گیا ہے کہ اس طبقے کا ناپاک وجود شہریوں کی عزت، شرافت، مردانگی اور پرہیز گاری کو گھن کی طرح چاٹ رہا ہے۔ سکولوں اور کالجوں میں فیل ہونے والے طلبہ کی ناکامی کا سبب بھی اسی طبقے کو کہا گیا ہے۔ شہر کی بہو بیٹیوں کے اخلاق پر پڑنے والے برے اثرات کی وجہ بھی یہی عورتیں ہیں۔ یوں افسانے کے ابتدائی دو تین صفحات سے یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ معاشرے میں موجود ہر برائی کی وجہ یہی طبقہ ہے اور اس طبقے کے علاوہ باقی سب لوگ معصوم، شریف، نیکوکار اور پرہیز گار ہیں۔ تاہم آگے چل کر متن سے خود ہی اس موقف کی تردید بھی ہو جاتی ہے جب نئی بستی کے تعمیراتی مرحلے کا ذکر کرتے ہوئے بتایا جاتا ہے:

> "کبھی کبھی شہر کے لفنگے، اوباش و بیکار مباش شہر سے پیدل چل کر بیسواؤں کی اس نئی بستی کی سن گن لینے آجاتے۔۔۔۔ فقرے کستے، بے تکے قہقہے لگاتے، عجیب عجیب شکلیں بناتے اور مجنونانہ حرکتیں کرتے۔"(1)

ان نوجوانوں کی یہ غیر اخلاقی حرکات یقیناً عام لوگوں کے ساتھ ساتھ ان بیسواؤں کے لیے بھی ایذا رسانی کا باعث بنتی ہوں گی؛ تاہم متن میں اس طبقے کو کہیں بھی اخلاقی زوال کا ذمہ دار قرار نہیں دیا گیا۔ اسی طرح متن میں

ان عورتوں کے "عشاق" کا ذکر بھی دو جگہ پر ہوا ہے لیکن پورے افسانے میں کہیں بھی ان عشاق کے لیے کوئی غیر مناسب لفظ استعمال نہیں ہوا۔

افسانے میں خیر اور شر کی قوتوں کو بیان کیا گیا ہے۔ خیر کی قوتیں انسانیت، شرافت اور تہذیب ہیں جن کے نمائندگان کے لیے "شرفاء کی پاک دامن بہو بیٹیاں"، "شریف زادیاں" ہمارے بھولے بھالے ناتجربہ کار، جوانی کے نشے میں محو، سود و زیاں سے بے پروا نونہالانِ قوم" ہمارے بھولے بھالے شہری" جیسے سگنفائرز استعمال کیے گئے ہیں۔ جب کہ شر کی قوتوں کا نمائندہ ایک ہی طبقہ ہے جس کے لیے "زنانِ بازاری"، "قحبائیں"، "بیسوائیں" اور "اُن عورتوں" کے سگنفائرز متن میں ملتے ہیں۔ دونوں طرح کے کرداروں کے حوالے سے خیر اور شر کا موقف راوی (مصنف) کا ذاتی بیانیہ ہے۔ دونوں طبقات سے تعلق رکھنے والے کرداروں میں سے کوئی بھی کردار متکلم صورت میں افسانے میں سامنے نہیں آیا۔ یوں ان کرداروں کے قول و فعل کو واضح کیے بغیر ان کے بارے میں ایک رائے پیش کر دی گئی ہے۔

افسانے کے شروع میں جس بازارِ حسن کا تذکرہ کیا گیا ہے اسے بلدیہ کے اراکین بار بار اخلاقی اور تہذیبی بگاڑ کی وجہ بتاتے دکھائے گئے ہیں۔ اس سے افسانے کی ابتدا میں یہ تاثر قائم ہوتا ہے جیسے اس شہر میں ایک عام آدمی کو اخلاقی اور قانونی حوالے سے تحفظ حاصل ہے۔ تاہم آگے چل کر متن کے مطالعے سے یہ تاثر زائل ہو جاتا ہے اور یہ امر سامنے آتا ہے کہ اس شہر میں عام شہری کو شہریت کے بنیادی حقوق ہی حاصل نہیں ہیں۔ زنانِ بازاری کو شہر بدر کرنے کے فیصلے پر جب طوائفوں نے احتجاج کیا تو انھیں بھاری جرمانے کے ساتھ سزائیں بھی سنائی گئیں تاہم بلدیہ کے فیصلے کے آگے ان کی ایک نہیں چل سکی۔

زمانی و مکانی تناظر سے دیکھا جائے تو افسانے میں وقتاً فوقتاً ایسے اشارے ملتے ہیں جن سے جگہ اور وقت کا تعین آسان ہو جاتا ہے۔ پوری کہانی کے واقعات بیس، اکیس برس کے دورانیے پر محیط ہیں۔ کہانی کے شروع میں بلدیہ کے اجلاسوں کا دورانیہ ایک مہینہ بتایا گیا ہے۔ "یہ مسئلہ کوئی مہینہ بھر تک بلدیہ کے زیر بحث رہا۔" شہر بدری کا فیصلہ ہونے کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ "ایک عرصے تک ان زنانِ بازاری کے مملوکہ مکانوں کی فہرستیں اور نقشے تیار ہوتے رہے۔ لفظ "ایک عرصے تک" صحیح دورانیے کی وضاحت کرنے سے قاصر ہے کیونکہ یہ عرصہ دنوں، مہینوں اور سال تک محیط ہو سکتا ہے۔ افسانے کے اختتام پر جہاں دوبارہ شہر بدری کا فیصلہ کیا جاتا ہے وہاں اس شہر کی آبادکاری کا دورانیہ بیس برس بتایا گیا ہے۔ یوں پورے افسانے کا زمانی دائرہ کار بیس سے اکیس برس بنتا ہے۔ افسانے میں جس جگہ کو موضوع بنایا گیا ہے اُس کے لیے "شہر" "بازار" اور "بستی" جیسے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ تاہم افسانے کے مجموعی مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کوئی قصبہ ہے کیونکہ طوائفوں کو جب شہر بدر کیا جاتا ہے تو جس نئے شہر کی بنیاد ڈالی

جاتی ہے وہ شہر سے چھ کوس دور ہے اور اس کی طرف پانچ کوس تک پکی سڑک جاتی ہے اور اس سے آگے ایک کوس کچی سڑک ہے۔ علاوہ ازیں آنندی شہر کے گرد و نواح کی جو پیش کش افسانے میں کی گئی ہے وہ اس طرح سے ہے:

"اس علاقے کے نواح میں کچے گھروندوں والے کئی چھوٹے چھوٹے گاؤں تھے۔۔۔ان گاؤں کے بسنے والے کسان دن کے وقت کھیتی باڑی کرتے یا یونہی پھرتے پھراتے ادھر نکل آتے۔"(2)

کچے گھروندوں، کسان اور کھیتی باڑی جیسے کوڈز سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ یہ ایک خالصتاً دیہی علاقہ ہے۔ شہر چونکہ یہاں سے چھ کوس دور ہے اس لیے یہ قصباتی علاقہ معلوم ہوتا ہے۔

آنندی شہر کے آثارِ قدیمہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس شہر کی ایک تہذیبی و ثقافتی تاریخ ہے۔ کھنڈرات میں ایک جگہ مسجد کے آثار ہیں اور اس کے پاس ایک کنواں بھی ہے۔ بستی میں ایک جگہ ٹوٹا پھوٹا مزار بھی ہے۔ یہ تمام مذہبی کوڈز اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ اس علاقے کی غالب آبادی مسلمان تھی۔ افسانے میں اس قدیم شہر کی جگہ جو نئی بستی بسائی گئی ہے اس کے مذہبی کوڈز بھی اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ اس علاقے کی آبادی مسلمان ہے اور ان کی مذہبی عقیدت کا اظہار مساجد اور درباروں سے خاص طرح کی وابستگی کے ذریعے ہوتا ہے۔ تاہم متن میں ایک جگہ لفظ "بدھ کا شبھ دن" استعمال ہوا ہے جس سے متن میں مذہبی حوالے سے ایک تذبذب کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ بدھ کا دن بدھ مت کے ماننے والوں کے ہاں مقدس دن کہلاتا ہے۔ اس کنفیوژن کی وجہ شاید مصنف کا غیر شعوری اظہار یہ ہے وگرنہ پورے افسانے میں اس ایک بیانیے کے علاوہ کہیں بھی بدھ مذہب کا کوئی تہذیبی یا ثقافتی حوالہ موجود نہیں ہے۔

مزاروں سے محبت اور عقیدت کا اظہار طوائفوں کے ہاں زیادہ جذباتیت کا حامل ٹھہرتا ہے۔ نئی بستی میں منتقل ہونے سے پہلے وہ بہت بھاری نیاز دلواتی ہیں۔ مزار کی صفائی کا بندوبست کیا جاتا ہے، اس پر پھولوں کی چادر چڑھائی جاتی ہے اور فقیر کو نیا جوڑا سلوا کر پہنایا جاتا ہے۔ اس مذہبی سیاق سے ہٹ کر بھی یہ بیسوائیں تہذیب یافتہ سوچ اور اندازِ زندگی کی حامل دکھائی گئی ہیں:

"شام کو شامیانے کے نیچے دودھ سی اجلی چاندنی کا فرش کر دیا گیا۔ گاؤ تکیے، پان دان، پیک دان، پیچواں دانی اور گلاب پاش رکھ دیے گئے اور راگ رنگ کی محفل سجائی گئی۔۔۔ان کے سامنے کے رخ سرخ چقیں ڈال دی گئیں۔"(3)

متن میں طوائفوں کے ہاں یہ تہذیبی و ثقافتی کوڈز افسانے کی ابتدا میں مصنف کے تشکیل کردہ بیانیے کو رد کرتے ہیں جس کے مطابق طوائفوں کا یہ طبقہ انسانیت، شرافت اور تہذیب کے دامن پر بدنما دھبہ ہے۔ یہاں تہذیب

سے مراد اگر زندگی گزارنے کا سلیقہ اور قرینہ ہے تو متن کے مطابق تو یہ طبقہ انتہائی تہذیب یافتہ اور زندگی کی رعنائیوں سے معمور ہے۔ ان کے ہاں جس رکھ رکھاؤ اور مہمان نوازی کا مظاہرہ ملتا ہے وہ مثالی ہے۔ طوائفوں کے جس طرزِ زندگی کی وضاحت متن کرتا ہے اس میں جھاڑ، فانوس، ظروفِ بلوریں، قد آدم آئینے، نواڑی پلنگ، جیسے ثقافتی حوالوں کے ساتھ ساتھ رقص و سرور کی تعلیم، غزلیں یاد کرنا، دھنیں بٹھانا، سبق پڑھنا، تختی لکھنا، سینے پرونے، کاڑھنے، گراموفون سننے، تاش اور کیرم کھیلنے، ضلع جگت اور بناؤ سنگھار جیسے تہذیبی حوالے اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ ان عورتوں کی تربیت خاص طرح کے ماحول اور فضا میں ہوتی ہے۔ اگر اس تربیت یافتہ فضا میں پرورش پانے والی خواتین کو تہذیب کے نام پر دھبہ کہا جا رہا ہے تو یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ راوی کا اپنا تہذیب اور شرافت کا معیار کیا ہے؟ کیا محض اس پیشے سے وابستگی ہی ان کا سب سے بڑا جرم ہے جس کی وجہ سے وہ اخلاقی اور کرداری حوالے سے معتوب ٹھہرتی ہیں؟

یہ بیسوائیں اپنے معمولاتِ زندگی کے علاوہ بھی دیگر انسانی معاملات میں بہت وضع دار نظر آتی ہیں۔ متن میں خیر کا دوسرا معیار انسانیت ہے جس پر انھیں بدنما دھبہ کہا گیا ہے۔ تاہم متن اس بات کی بھی نفی کرتا ہے۔

> "اس بستی کے رہنے والوں کی سرپرستی اور ان کے مربیانہ سلوک کی وجہ سے اسی طرح دوسرے تیسرے روز کوئی ٹٹ پونجیا دکاندار، کوئی بزاز، کوئی پنساری، کوئی نیچہ بند، کوئی نانبائی مندے کی وجہ سے یا شہر کے بڑھتے ہوئے کرائے سے گھبرا کر اس بستی میں آپناہ لیتا۔"(4)

یہاں "سرپرستی" اور "مربیانہ سلوک" جیسے سگنی فائر اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ انسانی ہمدردی اس طبقے کی خاص شناخت ہے۔ اس نئی بستی کا ماحول روزگار اور رہائش کے لیے بہت ساز گار بتایا گیا ہے جبکہ جس شہر کی بلدیہ نے انھیں معتوب قرار دیا ہے اس شہر کی فضا کاروباری طبقے کے لیے وبالِ جان بنی ہوئی تھی۔ لوگ کرایوں کی زیادتی اور کاروبار کی مندی کی وجہ سے تنگ آ کر یہاں آنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

افسانے میں کرداروں کی بہتات ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ افسانے میں کرداروں اور پیشوں کا ایک میلہ لگا ہوا ہے۔ ان میں سے زیادہ تر کردار اجتماعی ہیں، انفرادی کرداروں میں صرف بلدیہ کے اراکین متکلم کرداروں کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔ تاہم یہ کردار بھی اپنے ناموں کے ساتھ سامنے نہیں آتے بلکہ انھیں ان کے گزشتہ پیشوں، دلچسپیوں یا ان کی طبعی ساخت کے حوالے سے متعارف کرایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر "بلدیہ کے ایک بھاری بھر کم رکن"، "ایک رکنِ بلدیہ جو کسی زمانے میں مدرس رہ چکے تھے"، "ایک رکن جو چشمہ لگائے تھے" اور "ایک پنشن یافتہ معمر رکن" جیسے ناموں سے ان کی شناخت بتائی گئی ہے۔ اسی طرح مختلف پیشوں کے حوالے سے جو کردار سامنے آتے

ہیں وہ بھی اپنے پیشے کی مناسبت سے پہچانے جاتے ہیں جیسے کبابی، بھٹیاری، نائی، کسان، منشی صاحب، معمار، مزدور، کنجڑا، امام مسجد، بنیا، حلوائی، شیر فروش، قصائی، پھول والا، حجام، رنگریز، بساطی، عطار، تانگے والے، مہاجن، فوٹو گرافر، لانڈری والا، پنواڑی، گھڑی ساز، ڈاکٹر وغیرہ۔ افسانے کے ابتدائی دو صفحات کے بعد ان پیشہ وروں کے پیشوں کی جزئیات اور شہر میں نئے قائم ہونے والے اداروں کی تفصیلات ملتی ہیں۔ یہ تفصیلات اتنی زیادہ ہیں کہ افسانے کے اختتام پر ان کی باقاعدہ ایک فہرست مرتب کی جاسکتی ہے۔

صنفی تفریق کے حوالے سے بھی متن بتاتا ہے کہ انفرادی کرداروں میں مصنف کا جھکاؤ مرد کرداروں کی طرف ہے۔ عورتوں کے انفرادی کرداروں میں ایک خوانچہ فروش بڑھیا کا ذکر ملتا ہے لیکن اس کا بھی کوئی مکالمہ نہیں ہے۔ اسی طرح بیسواؤں کا ذکر اجتماعی کردار کی صورت میں ہوتا ہے اور ان میں سے بھی کوئی کردار متکلم صورت میں نہیں ملتا۔ تاہم افسانے میں کچھ اجتماعی کرداروں کا ذکر کرتے ہوئے عورتوں کے اجتماعی کرداروں کا حوالہ الگ سے ملتا ہے۔ مثلاً مزدوروں کے ساتھ "مزدورنیوں" کا ذکر، فقیروں کے ساتھ "فقیرنیوں" کا ذکر اور دیہاتیوں کے ساتھ "دیہاتنوں" کا ذکر کیا گیا ہے۔

افسانے کا راوی آغاز سے ہی واقعہ نگاری پر حاوی نظر آتا ہے۔ راوی کا کام صرف اسماء کے بیان سے کہانی کو آگے بڑھانا ہوتا ہے؛ ان کی صفات بیان کرنا نہیں ہوتا۔ آنندی کا راوی اسماء کے ساتھ صفات کو بھی بیان کر رہا ہے۔ مثلاً "شرفاء کی پاک دامن بہو بیٹیاں"، آبرو باختہ نیم عریاں بیسواؤں""بھولے بھالے شہری""برد بار آدمی"اور" خوردسال لڑکا" وغیرہ۔ اسی طرح افسانے کا آغاز واقعہ نگاری سے ہوتا ہے۔ بعد ازاں افسانے کا بیانیہ تذکرہ نگاری کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور اختتام تک آتے آتے خبریہ جملوں کی وجہ سے رپورٹنگ کا انداز غالب آجاتا ہے۔

اس افسانے کے حوالے سے غلام عباس کے دو معاصر ناقدین ن۔ م راشد اور محمد حسن عسکری کی تنقیدی رائے کو سامنے رکھا جائے تو دونوں نے اسے معاشرتی رویوں پر طنز کہا ہے۔ مثلاً ن۔ م۔ راشد لکھتے ہیں:

> "اس کہانی میں غلام عباس نے اس عورت کے گرداگرد جس طرح ایک پورے شہر کی تعمیر منزل بہ منزل دکھائی تھی، وہ ایک طرف تو پوری تہذیبی ترقی کی تمثیل تھی۔ دوسری طرف اخلاق کے ان نیک دل اور نیک نیت نگہبانوں پر ایک خندہ تضحیک تھا جو ہر تجربے کے باوجود یہ سمجھتے ہیں کہ گناہ کو اگر شہر بدر یا انسان بدر کر دیا جائے تو ہمیشہ کے لیے روپوش ہو جاتا ہے اور پھر کبھی سر نہیں اٹھاتا، جو یہ سمجھتے ہیں کہ قانون کے ایک ہی تازیانے سے ہر بدی کو ہمیشہ کی نیند سلایا جاسکتا ہے۔"(5)

اس تنقیدی رائے سے واضح ہوتا ہے کہ قانون کے نام نہاد محافظوں کے غیر منطقی فیصلوں کو طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ اسی طرح محمد حسن عسکری کا نقطۂ نظر بھی یہی ہے کہ "آنندی کیا بن رہا ہے ایک نیا فریب بن رہا ہے۔ اسی وجہ سے شہر کی تعمیر ایک خاص طنزیہ معنویت اختیار کر لیتی ہے۔"(6)

ان دونوں تنقیدی آرا سے واضح ہوتا ہے کہ افسانے کی بنیادی فکر دوہرے معاشرتی معیارات اور استحصالی رویے ہیں جس کی وجہ سے عورتوں کا یہ طبقہ استحصال کا شکار ہوتا ہے۔ بادی النظر میں بھی اس افسانے کا موضوع طوائفوں کا استحصال اور لا قانونیت ہی ہے، تاہم متن کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس افسانے کا بنیادی موضوع نئے شہر کی آبادکاری اور اس سے وابستہ مسائل اور حکمت عملیاں ہیں۔ موجودہ سماجی تناظر میں اس طرح کی نئی آبادیوں کے لیے Societies کی اصطلاح مروج ہے۔ آنندی شہر بھی انہی سوسائیٹیز کی طرز پر تعمیر کیا گیا ہے۔ اس کی تعمیر کے لیے بھی غلام عباس نے جو پوری فضابندی کی ہے اس کے لیے پہلے مرحلے کے طور پر نقشے بنائے جاتے ہیں، مکانوں کی فہرستیں تیار ہوتی ہیں، بیسواؤں کے پرانے مکانوں کے گاہک پیدا کیے گئے، پھر نئی جگہ مکانات کی تعمیر کی وجہ سے ان بیسواؤں کو اپنے پرانے مکانوں میں چھ مہینے رہنے کی رعایت دی جاتی ہے۔ نئی بستی میں مکانات کی جو ترتیب بتائی گئی ہے وہ ایک چوڑی سڑک کے دونوں طرف ایک جیسے دو منزلہ مکانات تعمیر کیے گئے۔ اس دورانیے میں وہاں ہر طرح کے کاروبارِ زندگی سے تعلق رکھنے والے پیشہ ور اپنے کاروبار چمکانے لگتے ہیں۔ کرائے کے لیے جو مکانات تعمیر کیے جاتے ہیں ان کے گاہک بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ نئی بستی میں سکول، کالج، ڈاک خانہ، ہسپتال اور دیگر تمام سرکاری اداروں کا قیام عمل میں لایا جاتا ہے۔ اس قدر تیزی سے ہونے والی آبادکاری کی وجہ سے لوگوں کی بڑی تعداد اس نئے شہر کا رخ کر لیتی ہے۔ ان ساری تفصیلات کو پڑھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ اس افسانے کو لکھنے کا محرک نئے شہر کی آبادکاری اور اس سے وابستہ تفصیلات ہیں۔، معاشرے کے دوہرے معیارات اور نام نہاد قانون ساز اداروں پر کیا جانے والا طنز افسانے کے فکری دھارے میں ثانوی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔ اس افسانے کی تخلیق کے حوالے سے غلام عباس کا اپنا موقف بھی یہی ہے:

> "یہ علاقہ میرے راستے میں تھا اور میں ہر روز دفتر آتے جاتے اسے بنتا سنورتا دیکھتا رہتا تھا۔ مشاہدے کے ساتھ ساتھ تھوڑی سی خیال آمیزی افسانے کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے۔ واقعہ صرف اتنا تھا کہ طوائفوں کو چاوڑی سے نکال دیا گیا تھا اور میں نے اس طبقے کو شہر سے کوسوں دور ایک اجاڑ مقام پر لے جا پھینکا تھا۔"(7)

مجموعی طور پر اس افسانے کا متن مصنف مرکز ہے، افسانے کے ابتدائی دو صفحات میں بلدیہ کے اجلاس کے مناظر دکھائے گئے ہیں۔ ہر چند کہ واقعہ تو زنان بازاری کے شہر بدر کرنے کا ہے لیکن اس زنان بازاری کا کوئی منظر

بیان نہیں کیا گیا بلکہ متن کی ساری توجہ نئے شہر کی آباد کاری کے مناظر بیان کرنے پر مبذول ہے۔ نئی آبادی کی تعمیر، ضروریاتِ زندگی کی فراہمی اور اس شہر میں تیزی سے لوگوں کی آباد کاری کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ تمام مراحل انتہائی ساز گار ماحول میں طے پاتے ہیں۔ کہیں پر بھی کسی سیاسی یا قانونی رکاوٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ یوں مصنف کے تخیل کی آمیزش سے واقعہ نگاری دب کر رہ گئی ہے۔ فنی اعتبار سے بھی افسانے میں کچھ خلا موجود ہیں۔ مثلاً تہذیبی و ثقافتی حوالوں کی پیش کش میں کچھ جگہوں پر جھول نظر آتا ہے۔ نئی بستی کی تعمیر میں جتنے مذہبی کوڈز کو بیان کیا گیا ہے وہ سب اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ وہاں کی غالب آبادی مسلمان ہے، تاہم افسانے کے آخر پر بیس برس بعد کے جس شہر کا نقشہ واضح کیا گیا ہے اس میں مساجد کے ساتھ ساتھ پندرہ مندروں اور دھرم شالوں کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں کی آبادی میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ غیر مسلموں کی بھی بڑی تعداد موجود ہے۔ اسی طرح افسانے کے اختتام پر شہر کی آبادی ڈھائی لاکھ بتائی جا رہی ہے؛ زمانی اعتبار سے اتنے کم وقت میں ڈھائی لاکھ کی آبادی کا کسی نئی جگہ پر بس جانا محال نظر آتا ہے۔ افسانے کا راوی ہمہ بین ہے۔ اس لیے اس کا اُسلوب مکالماتی نہیں بیانیہ ہے۔ یہ راوی ہر جگہ موجود ہے اور صرف مناظر یا واقعات بیان کرنے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ اس کی وضاحت بھی کرتا ہے۔ یوں افسانہ پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ مصنف خود راوی کے بیانیے میں شریک ہے جس سے متن افسانے سے زیادہ ایک نئے شہر کی آباد کاری کی رپورٹ بن جاتا ہے۔

حواشی و حوالہ جات

ا۔ غلام عباس، آنندی، لاہور: مکتبہ جدید، 1955ء، ص240

2۔ ایضاً، 235

3۔ ایضاً، 244

4۔ ایضاً، 248

5۔ ن۔م۔ راشد، تمہید، مشمولہ: جاڑے کی چاندنی از غلام عباس، کراچی: سجاد کامران ہاؤسنگ سوسائٹی، 1960ء ص7-8

6۔ محمد حسن عسکری، غلام عباس کے افسانے، مشمولہ: کلیات غلام عباس، مرتبہ ندیم احمد، کلکتہ: راہروانِ ادب، 2016ء، ص39

7۔ طاہر مسعود، یہ صورت گر کچھ خوابوں کے، کراچی: تخلیق ادب، 1985ء، ص39

References in Roman Script:

1. Ghulam Abbas, Aanandi, Lahore: Maktaba-i Jadeed, 1955, P240
2. Ghulam Abbas, Aanandi, P235
3. As Above, P244

4. As Above, P248
5. Noon Meem Rashid, Tamheed, Mashmoola: Jaarry ki Chandni by Ghulam Abbas, Karachi: Sajjad Kamran Housing Society, 1960, P7-8
6. M. Hassan Askari, Ghulam Abbas kay Afsaany, Mashmoola: Kuliyat-i Ghulam Abbas, Murattiba Nadeem Ahmad, Kolkata: Rahrawan-i Adab, 2016, P39
7. Tahir Masood, Yeh Surat-Gar kuchh Khaabo'n kay, Karachi: Takhleeq-i Adab, 1985, P39